کچھ یادیں

سلطان مقصود

کبھی کبھار جب ذہن زیادہ رنگ آلود ہو جاتا ہے تو اسے صیقل کرانے کے لیے حضورِ مرزا منور میں چلا جاتا ہوں۔ وہاں غالب، بیدل۔ علامہ کے علاوہ ہندو ازم۔ پاکستان اور اسلام پر سیر حاصل گفتگو ہو جاتی ہے یا بقول مرزا صاحب پینتالیس منٹ کا پیریڈ ہو جاتا ہے۔

دقت یہ ہے کہ موصوف آج کل دو کشتیوں کے کھیون ہار ہیں ''غرقاب محبت کا اللہ نگہبان ہو''۔ انہیں ملنا ہو تو اتنے بجے سے اتنے بجے تک یہاں ہوتے ہیں اور پھر اتنے بجے سے اتنے بجے تک وہاں ہوتے ہیں اور اکثر ہوتے کہیں بھی نہیں۔ آپ محنت کرکے یہاں، وہاں تک چلے جائیں تو پتہ چلتا ہے کہ ابھی ابھی ریڈیو یا ٹیلی ویژن والے انہیں اغوا بالجبر یا بالرضا کرکے لے گئے ہیں۔

ایک دن ایک عزیز کی ضد پر بالآخر انہیں وہاں یعنی اقبال اکادمی میں ڈھونڈ ہی لیا۔ اکادمی کا دفتر اس گھر میں ہے جہاں کبھی علامہ سے مجھے شرف ملاقات ہوا تھا۔ ذکر کیا تو مرزا منور صاحب نے چند کتابیں عنایت کیں اور حکم دیا کہ اس ملاقات کی روئیداد لکھو۔ میں نے فیصلہ کیا کہ جستہ جستہ جو یادیں بھی ماضی کے دھندلکے سے ابھرتی ہیں وہ لکھ دوں۔ تو سنیئے:

پہلی یاد: اس صدی کے تیسرے دہے کی بات ہے کہ مرحوم تاثیر نے ایک فرشی مشاعرے کے لیے علامہ سے ایرانی قالین مانگنے کے لیے مجھے اور مرحوم محمود نظامی کو بھیجا۔ اہل زبان کی تقلید میں ایسے مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ قالین بچھ جاتے تھے۔ گاؤ تکیے لگ جاتے تھے۔ طشتری میں گلوریاں شعرائے کرام کو پیش ہوتی تھیں۔ کلام شمع کی روشنی میں پڑھا جاتا تھا۔ ایسے مشاعرے اکثر طرحی ہوتے تھے۔ تاثیر مرحوم

قلم برداشتہ غزلیں لکھ کر تین چار بناوٹی شعراء کے حوالے کر دیتے تھے جو عرض کیا ہے سے مقطع تک اپک اپک کر سنایا کرتے تھے اور بڑی بھاری سے جھک جھک کر اور کورنش بجا لا کر داد وصول کرتے تھے - میں بھی ان ''دلاور 'درزوں'' میں سے ایک تھا اور مزید ستم یہ تھا کہ میں ہی ترنم سے مشاعرے کا اختتام کرتا تھا - ہمارے ایک مرحوم دوست بلا کے سینہ زور تھے - ایک ایسی ہی غزل میں شعر تھا -

تجھے وہم ہوا ہے مجھے کیوں اٹھا رہا ہے - میری جانے سجدہ ہے یہ تیرا نقش پالین ہے - اس شعر پر بہت داد ملی - بعد میں ستم بالائے ستم یوں ہوتا کہ وہ اکثر ہم سے بھی اس شعر پر اپنا حق سمجھ کر داد وصول کرتے رہے -

یادوں کی بھول بھلیاں میں بات ذرا بڑھ گئی ہے - ذکر قالین مانگنے کا تھا - ان دنوں اس گھر کے آگے کشادہ دالان تھا - سڑک سے گھر واضح نظر آتا تھا - اب تو دور ایک کونے میں سہما ہوا اور دبکا ہوا ہے - ہمیں فوراً شرف باریابی حاصل ہو گیا - اس درگاہ میں کسی ''حاجب و دربان'' کی ضرورت نہ تھی - طلباء کے لیے رسائی بہت پھیلی تھی - مرحوم 'لنگی اور بنیان پہنے حقہ پی رہے تھے - قالین لپٹے ہوئے دیواروں کے ساتھ پڑے ہوئے تھے - ہم نے للچائی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھا اور دل ہی دل میں خوش ہوئے کہ چلو قالین بغیر کسی اکھاڑ پچھاڑ کے مل جائیں گے - کافی دیر تک تو ہم اس ''دبدبہ' قلندری'' سے مبہوت رہے - زبانیں گنگ تھیں حرف مدعا کیسے کہتے - علامہؒ نے ایک دو دفعہ حقے کی گڑ گڑ کے ساتھ لانبی ہوں کی اور ہماری طرف متوجہ ہوئے - مرحوم طلباء سے بے انتہا شفقت اور مروت سے پیش آتے تھے - غالباً اسی بنا پر تاثیر صاحب نے حالانکہ وہ خود ''بیباک زبان و بیان'' کے مالک تھے - ہمیں قالین مانگنے کے لیے بھیجا تھا - اب پتہ چلتا ہے کہ جو لوگ ان کی عظمت کے جلال و جمال سے آگاہ تھے ان کی محفل میں کیوں ''نفس گم کردہ'' ہو کر رہ جاتے تھے - ہماری محبت اور عقیدت اس وقت تک ان کی لازوال اور بے کراں عظمت کو محیط نہ تھی - اس لیے ہم ایک گونہ گستاخی کے مرتکب ہو سکتے تھے - میں تو دیوار کی تصویر بنا بیٹھا رہا - نظامی مرحوم نے 'رک 'رک کر عرض مدعا کر ہی دی اور استدعا کو موثر بنانے کے لیے یہ اضافہ

بھی کر دیا کہ شیخ عبدالقادر مرحوم میر مشاعرہ ہوں گے ۔ ایک طویل ''ہوں'' کے ساتھ ہماری سفارت کی ناکامی کا فیصلہ سنا دیا گیا ۔ ہم دونوں کو اس انکار سے ایک انجانی سی تسکین ہوئی ۔ کیا یہ خنک بختی کم تھی کہ یوں شرف ملاقات تو نصیب ہوا ۔ دامن جھاڑ کے خوش و خرم واپس آ گئے ۔ تاثیر صاحب کو اس انکار پر نہ کوئی اچنبا ہوا اور نہ دکھ ۔

شیخ عبدالقادر مرحوم ادبی اور ثقافتی محفلوں کی صدارت بڑی خندہ پیشانی سے قبول کر لیا کرتے تھے ۔ نظامی مرحوم تھوڑے سے شرارتی بھی تھے ۔ جب صدارت زیر غور آئی تو شک گزرا کہ شیخ صاحب مصروفیت کی وجہ سے کہیں انکار نہ کر دیں ۔ نظامی نے کہا یہ ناممکن ہے ۔ وہ تو ہاروں کی توقع میں دعوت پر ہی گردن آگے کر دیتے ہیں ۔

مشاعرہ ہوا ۔ صدر اور شعرائے کرام قالینوں پر تکیوں کے سہارے براجمان تھے ۔ طارق مرحوم شمع بردار تھے ۔ گلوریاں پیش ہوئیں ۔ شعراء نے شمع کی مدہم روشنی میں ۔ پیکدانوں کو اکثر استعمال کرنے کے بعد مطلع سے مقطع تھا ۔ ''سبحان اللہ'' ۔ ''مکرر ارشاد'' پر بار بار داد وصول کی ۔ تمایاں داد شیخ صاحب مرحوم کی تھی جو اظہار تحسین کے لیے ہاتھ بھی بلند کرتے تھے اور شعر دہراتے تھے ۔ ابتدا میں نے ترنم سے اسی مستعار غزل سے کی اور خوب داد وصول کی ۔ یہ تھی اس دور کے لاہور کی ایک جھلک جو اب ''زندہ باد'' اور ''مردہ باد'' کے نعروں میں کھو گیا ہے ۔

دوسری یاد : ایس ۔ پی ۔ ایس کے ہال جس کی موجودہ حالت پر کسی ادارے کا بے رحمی میں چالان ہونا چاہیے ، گاہے بگاہے مشاعروں اور جلسوں کے لیے چنا جاتا تھا ۔ علامہ ؒ ایک مشاعرے کے صدر تھے ۔ ڈھیلی ڈھالی سفید پگڑی کھلے گلے کا لانبا کوٹ سفید شلوار اور سیاہ گرگابی لباس میں شامل تھے ۔ غالباً ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۳ء کا درمیانی دور تھا ۔ دھندلی سی یاد باقی ہے ۔ فرمایا میری صحت اجازت نہیں دیتی کہ شاموں کو باہر آؤں لیکن منتظمین کے اصرار پر آنا پڑا ۔ مشاعرہ لاہور کے روایتی ہنگامہ پرور اسلوب کے برعکس وہ نہایت مہذبانہ طور پر ختم ہوا ۔ اصرار ہوا کہ علامہ بھی کچھ عطا فرمائیں ۔ ارشاد ہوا :

بآ دے نرسیدی خدا چہ لے جوئی
زخود گریختہ آشناچہ مے جوئی
دو قطرہ خون دل است آنچہ مشک می نا مد
تو اے غزالِ حرم در خطہ چہ مے جوئی

اب جب بھی اس خستہ و ریختہ عمارت کے قریب سے گزرتا ہوں تو یہ یاد لپک کر ذہن اور روح کو سیراب و سرشار کر دیتی ہے ۔

تیسری یاد : اکبری دروازہ کے باہر ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۳ء کے درمیانی دور میں مسلم لیگ کا جلسہ تھا ۔ علامہؒ صدر تھے ۔ ڈھیلی ڈھالی سفید پگڑی ۔ سفید ہی شلوار اور قمیض ۔ کھلے گلے کا لانبا کوٹ اور کالی گرگابی ۔ ڈائس پر مجھے واضح طور پر سید امجد علی اپنی طرہ دار پگڑی ور خوبصورت جوانی کی وجہ سے یاد ہیں ۔ غالباً راجہ غضنفر علی مرحوم بھی طویل رنگ دار طرے اور اونچے کلاہ سے مزین موجود تھے ۔ میں پنڈال میں دوستوں کے ہمراہ موجود تھا ۔ تاثیر صاحب نے ڈھونڈ لیا اور اشارے سے بلایا ۔ بدمزہ ہوگیا کہ شاید کوئی ایسا کام سپرد نہ کر دیں کہ باہر جانا پڑے ۔ بات کچھ اور تھی ۔ شو مئے قسمت باز ہے نصیب علامہؒ کے پانچ چھ شعر گا کر جلسے کا اختتام کرنے کو کہا ۔ پہلا شعر تھا ۔

نہیں منت کش تاب شنیدن داستان میری
خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زبان میری

گھبرا گیا ۔ علامہؒ کا کلام ۔ وہ خود ہی صدر جلسہ اور اجتماع اتنا ہرگزیدہ ۔ کیا کرتا ۔ سب نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں ۔ انکار کی جرأت نہ ہوئی ۔ روسٹرم کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا ۔ کہنیاں اس پر جما لیں ۔ ٹانگوں کو روسٹرم کے پائیوں نے سنبھالا دیا ۔ ادھ کھلی آنکھیں اشعار پر رکھیں ۔ علامہؒ قریب ہی دائیں طرف کرسی پر تشریف فرما تھے ۔ اشعار ترنم سے پڑھے ۔ علامہؒ کی لانبی ''ہوں'' ایک دو دفعہ سنائی دی ۔ پڑھ کر لڑکھڑاتا ہوا دوستوں کے پاس پہنچا ۔ دھڑام سے کرسی پر گر گیا ۔ پوچھا کہ کیسے رہا ۔ پتہ چلا کہ بہت اچھا رہا یقین نہیں آتا تھا ۔ شاید گھبراہٹ میں گلے میں غیر معمولی گھیرنا آ گئی ہو گی اب وہ تجربہ میری زندگی کا حسین اور معزز ترین کارنامہ ہے ۔

چوتھی یاد : میں اور رشید طارق مرحوم جاوید منزل گئے ۔ علامہؒ آرام کرسی پر لگی اور بنیان پہنے حقہ پی رہے تھے ۔ ہم قالین پر بیٹھ گئے کسی صاحب سے فرما رہے تھے کہ انفرادی ایغو جب اپنی صلاحیتوں اور ممکنات کو مکمل طور پر اجاگر کر لیتا ہے تو لاثانی ہو جاتا ہے ۔ وہ سپر ایغو (Super Ego) میں جذب نہیں ہوتا بلکہ ہم آہنگ ہو جاتا ہے اور وہ اپنی تقدیر کا معمار خود بن جاتا ہے ۔ بات پیچیدہ تھی ۔ کچھ پلے پڑی مگر زیادہ تر اوپر سے گزر گئی ۔ اکادمی کے موجودہ ناظم سے جو علامہؒ کے شیدائی ہیں ، اس کے مضمرات پر ایک لیکچر سن لیں گے ۔

پانچویں یاد : علامہؒ کے وصال کی خبر سن کر جاوید منزل پہنچا ۔ ''مومن کے لبوں پر تبسم دیکھا'' فقیر کے ''روز گار'' کے ''سر آمد'' ہونے اور دوسرے ''دانائے راز'' کے آنے یا نہ آنے کی الجھن لیے لاکھوں سوگواروں میں شامل ہو گیا ۔ اس یاد میں ایک اور واقعہ محفوظ ہے ۔ رشید طارق کے بڑے بھائی جو پریس برانچ میں ملازم تھے فرط غم سے نڈھال ہو کر پورچ میں بے سدھ ہو کر گر پڑے ، انہیں پانی پلایا ، سنبھالا دیا تو اٹھ کھڑے ہوئے ۔ جب علامہؒ کو آخری آرامگاہ کی طرف لے جا رہے تھے تو میرے بزرگ راجہ حسن اختر مرحوم نے مجھے کہا ''مقصود کیا تمہیں اس سانحے کی المناکی کا صحیح ادراک ہے ''تمہیں کچھ پتہ بھی ہے کیا ہو گیا ہے'' ۔ کچھ یوں چاہتے تھے کہ زمین و آسمان شق ہو جائیں اور فطرت بھی اس مہیب واقعے پر نوحہ کناں نظر آئے ۔ حکیم احمد شجاع جو اپنی منفرد ذات میں ایک ادارہ بلکہ تحریک تھے ۔ بڑے ڈرامائی انداز میں ہزاروں سال کے بعد پیدا ہونے والے دیدہ ور کے وصال پر فصیح و بلیغ اردو میں یہ بتا رہے تھے کہ ''متاع عقل و دانش آج اللہ والوں کی لٹ گئی ہے'' ۔

یوں ہم نے حکم الامت کو سطوت مغلیہ کے جلال و جمال کی مظہر اور ''خدنگ آخریں'' اورنگ زیب عالمگیر کی تعمیر کے دامن میں امت مسلمہ کے دوسرے ''ہست قرآن در زبان پہلوی'' کے ''نے نواز'' کو نئے سفر پر روانہ کیا ۔ اور یہ سوچتے ہوئے لوٹے کہ :

عمر ہا بر خویش می پیچید جود
تا یکے بے تاب جاں آید فرود

اقبال بحیثیت مفکر تعلیم

از

پروفیسر بختیار حسین صدیقی

زیرِ نظر کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے - ''مقاصدِ تعلیم ، طریقِ تعلیم'' ، مثالی دارالعلوم کا تصور'' اور روایت ، تغیر اور تعلیم کے بعد پانچویں باب میں اقبال کے نظریۂ تعلیم کا ابدیت ، اصولیت ، ترقی پسند تعلیم اور تعمیرِ نو کے مغربی نظریات سے مقابلہ کیا گیا ہے - چھٹے باب میں ۱۹۷۷ء میں مکہ معظمہ میں منعقد ہونے والی فرسٹ ورلڈ کانفرنس آن مسلم ایجوکیشن کو احیائے اسلام کی تحریک کے لیے ایک نیک شگون بتایا گیا ہے جس کا برصغیر پاک و ہند میں آغاز اقبال کے عالمی امن کے اس پیغام سے ہوا جو یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو آل انڈیا ریڈیو ، لاہور سے نشر ہوا - ساتویں اور آخری باب میں نمو کے تصور کا کامینوس ، روسو ، پسٹالوزی اور فروبل کے تعلیمی افکار پر اثر سے بحث کی گئی ہے اور اس کے بعد ''جسمانی اور روحانی نمو'' کی حیثیت سے اقبال کے تصور تعلیم کی وضاحت کی گئی ہے -

صفحات : ۴ + ۲۱۹ قیمت : ۳۲ روپے

اقبال اکادمی پاکستان

۱۱۶ - میکلوڈ روڈ ، لاہور